فیض اور نیا نوآبادیاتی نظام

ڈاکٹر محمد آصف*

Abstract:

Faiz has very resolutely poeticized his dear homeland and here residents. He visualizes his country and its people as his beloved. He declares his war against dictatorship as his passion. Faiz has always lamented over the miserable condition of his dear homeland and its people. He is very pathetic about the degradation of pride of his nation, the ignorance, starvation and about the doom as well. Faiz makes his imprisonment as his second home. His poetry written during his imprisonment has highlighted the symbols of classical poetry. So it has a general as well a universal appeal. Both of his poems and contains all the above mentioned elements. This short article highlights Faiz's poetic devices created during his imprisonment.

استعمار اور غلامی کی نوعیت، ماہیت اور نفسیات کو مدِ نظر رکھا جائے تو اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ملوکانہ فکر و فریب اور استحصال کے نتیجے میں جب غلام یا محکوم اقوام و افراد میں اپنی حق تلفی اور پسماندگی کا احساس جنم لیتا ہے تو ردِ عمل کے طور پر وہ اپنی گمشدہ شناخت اور سلب کیے گئے سیاسی سماجی و معاشی حقوق کے لیے جدوجہد، مزاحمت

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

اور احتجاج کا آغاز کر دیتے ہیں۔ یہ کشمکش یا تصادم کمزور اور طاقتور، حاکم اور محکوم، آزاد اور غلام، بورژوا اور پرولتاریہ طبقے کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کشمکش میں روشن خیال، انسان دوست اور ترقی پسند اقدار و رجحانات کے حامل تخلیق کار اس انقلابی جدوجہد اور مزاحمت کے لیے راہوں کو ہموار کرتے ہوئے اسے منزل تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں یہی فنکار اس معاشرے کا تخلیق ضمیر کہلاتے ہیں۔ چنانچہ نمرود، فرعون، بولہب و بوجہل کے ادوار میں آنے والے انقلاب ہوں یا انقلابِ فرانس، انقلابِ روس اور انقلابِ چین یہ سب اسی نتیجے کی طرف لے جاتے ہیں۔ برصغیر کے جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ سماج میں غالب (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) ابتدائی سطح پر اور پھر باقاعدہ طور پر) سرسید (۱۸۱۸ء-۱۸۹۷ء)، اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) اور فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء) ہمارا وہ تخلیقی ضمیر ہیں جنھوں نے فرسودہ نظام کے خلاف مسلسل مزاحمت کرتے ہوئے انقلاب کی راہوں کو ہموار کیے رکھا۔ اقبال نے خضرِ راہ کے بند ''سلطنت'' میں ''رمزِ آیۂ ان الملوک''، ''اقوامِ غالب کی جادوگری''، ''حکمران کی ساحری''، کی تصویرگری کرتے ہوئے نہ صرف ملوکیت کی نفسیات بیان کی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ بالآخر زبردست قوم اس طلسم کو جان لیتی ہے اور پھر:۔

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

(بانگِ درا/کلیاتِ اقبال اردو،ص ۲۷۴/۲۹۰)

فیض کا تعلق اسی باشعور، انقلابی اور استعمار شکن قبیلے سے ہے۔ فیض نے اقبال کے دورِ عروج میں آنکھ کھولی۔ یہ وہ دور ہے جب یورپی نوآبادیاتی نظام نے ایفروایشائی اور لاطینی ممالک کو اپنے پیچیدہ شکنجے میں جکڑا ہوا تھا ''سفید آدمی کا بوجھ'' میں (۱) جو سامراجی روح کارفرما تھی، ''تہذیبی مشن'' کی آڑ میں ملوکیت کے جو سامراجی نوآبادیاتی عزائم کارفرما تھے اقبال اپنے گہرے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر اس کی حقیقت تک پہنچ چکے تھے۔ وہ ملوکیت کے حربوں، مزاج اور نفسیات سے واقف تھے۔ اس کا ایک ثبوت تو وہ شذرہ ہے جو 'سفید فام قوموں کا بارِ امامت' کے عنوان سے ''شذراتِ فکرِ اقبال'' (۲) میں موجود ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''خضرِ راہ'' بھی بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے بند ''سلطنت'' اور ''سرمایہ و محنت'' میں اقبال نے انتہائی بلاغت و اختصار کے ساتھ ملوکیت اور غلامی کی نفسیات، حقیقت و ماہیت، اس کے مختلف حربوں اور ملوکیت کے وہ حیلے بہانے جو وہ مختلف اقوام کو غلامی پر رضامند رکھنے کے لیے کرتی ہے، اشارے کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت، جمہوریت اور انصاف کے نام پر مکر و فریب ہی ملوکیت اور نوآبادیاتی نظام کی نفسیات ہے اور اقبال نے اسے خوب پہچانا ہے۔ مثلاً

''خضرِ راہ'' کا یہ شعر:۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات

(بانگِ درا/کلیاتِ اقبال اردو،ص ۲۷۶/۲۹۲)

اقبال نے اپنی مختلف شعری ونثری تحریروں میں نوآبادیاتی نظام کی ماہیت،نفسیات، سفاکی،عیاری اور قالب بدلنے کی صلاحیت کا تجزیہ کیا ہے(۳)اگر پوری جدید اردو شاعری اور ادبی وشعری فکر کا تجزیہ کیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے بعد فیض احمد فیض ہی وہ شاعر ہیں جنہوں نے نوآبادیاتی نظام کی نہ صرف سامراجی روح کو پہچانا بلکہ اس کے خلاف فکری اور عملی مزاحمت بھی کی۔ وہ نہ صرف ''مشاہدہ'' کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے بلکہ ''مجاہدہ'' کا فرض بھی ادا کیا(۴)۔(اس حوالے سے اقبال اور فیض کا تقابل بے حد تفصیلی مطالعہ کا متقاضی ہے۔موضوع اور خوفِ طوالت کے مدِنظر اس پر یہاں بات کرنا ممکن نہیں البتہ ہمارے آئندہ تحقیقی منصوبہ جات میں یہ موضوع اور اس کا تفصیلی مطالعہ شامل ہے۔)

عام گفتگو میں ملوکیت یا نوآبادیاتی نظام سے مراد ایک ملک کا دوسرے ملک پر تسلط ہے مگر علمی وسیاسی اصطلاح میں یہ نوآبادیاتی نظام یا امپریلزم باقاعدہ ایک آئیڈیالوجی کے ذریعہ منظّم کیا گیا۔اس لیے یہ ایک باقاعدہ نظریہ،ایک باقاعدہ فلسفہ ہے جس کی بنیاد ''تہذیبی مشن'' پر ہے۔اس تہذیبی مشن کا مقصد یہ ہے کہ ترقی یافتہ اور مہذب اقوام پسماندہ اقوام کو مہذب اور ترقی یافتہ بنائیں اور چونکہ مغرب مہذب اور ترقی یافتہ ہے اس لیے اس تہذیبی مشن کو پورا کرنا اس کی ذمہ داری ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ دیسی باشندہ سست،کاہل اور کند ذہن ہے اس لیے اس کو نہ مکمل علم دیا جاسکتا ہے، نہ حکومت، نہ ٹیکنالوجی، نہ تجارت اور نہ صنعت وسیاست۔یہ دیسی باشندہ ان پیچیدگیوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا اس لیے اس کو سرپرستی کی ضرورت ہے۔امپریلزم یا سامراج اپنے تہذیبی مشن کو پورا کرنے کے لیے کوئی بھی نظام اختیار کرسکتا ہے۔یہ نظام نوآبادیاتی نظام کہلاتا ہے۔یا یوں کہہ لیجئے کہ سامراج اپنے مقبوضات میں وسعت دینے کے لیے جو نظام اختیار کرتا ہے وہ نوآبادیاتی نظام ہے۔دوسری جنگِ عظیم سے پہلے تک یہ امپریلزم یا نوآبادیاتی نظام یورپ کی سرپرستی میں براہِ راست تھا لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب امریکی بالادستی کا دور شروع ہوا تو امریکہ نے بالواسطہ نوآبادیاتی نظام متعارف کرایا۔ماضی میں امپریلزم لوگوں کے سامنے تھا وہ اس کے ظلم وتشدد سے آگاہ تھے لیکن نیا امپریلزم نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ ہے اس کا اقتدار براہِ راست نہیں ہے۔ یہ نیا امپریلزم اب بین الاقوامی امداد، قرضوں، ٹیکنالوجی کی منتقلی، سماجی و ثقافتی تبادلوں، بین الاقوامی

اداروں (آئی ایم ایف، ورلڈ بنک، لندن کلب، پیرس کلب، یورپی یونین، تجارتی منڈیوں میں قیمتوں کے نظام پر کنٹرول اور سرمایہ کاری) کے ذریعے قائم ہے۔ نوآبادیاتی نظام یا امپریلزم طاقت، تشدد، جنگ، علم، ٹیکنالوجی، حکومت، سیاست، معیشت، تجارت، مشینریز، مستشرقین، ابلاغِ عامہ اور تعمیر و ترقی جیسے منصوبہ جات کے ذریعے سولھویں صدی میں یورپ کی سرپرستی شروع ہوکر آج بھی امریکہ کی سرکردگی میں پورے شدومد سے جاری ہے چنانچہ ۱۸۹۹ء میں کپلنگ کی اصطلاح ''سفید آدمی کا بوجھ'' میں ''تہذیبی مشن'' کی جو سامراجی روح کارفرما تھی وہی آج بھی فوکویاما کی End of History (تاریخ کا خاتمہ) اور ہنٹنگٹن کی Clash of Civilizations (تہذیبوں کا تصادم) میں کارفرما ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغربی استعمار کے اس عظیم تہذیبی مشن کا رُخ اب اسلام اور عالمِ اسلام کی طرف ہے۔(۵)

اقبال کے بعد یہ فیض ہی ہیں جن کی زندگی اور فکر نوآبادیاتی نظام کے خلاف براہِ راست ایک ردِعمل اور بھرپور مزاحمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ فیض کی شخصیت، فکر و فن اور زندگی کی تفہیم کے لیے نوآبادیاتی نظام کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض نے استعماری نظام کے خلاف نہ صرف فکری و عملی حیثیت سے حصہ لیا بلکہ وہ اس کی ماہیت، نفسیات، نوعیت، شکلوں، دائرہ کار اور استحصالی طریق کار سے بھی واقف تھے۔ مثلاً وہ بڑے آسان انداز میں سمجھاتے ہیں:۔

> ''امپریلزم کا تصور یہ ہے کہ امپریلزم یہ نہیں ہوتا کہ محض کسی ملک کو فتح کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک کے ذرائع کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ سامراجی ممالک نے نہ صرف دوسرے ممالک پر قبضہ کیا بلکہ ان ملکوں کی معیشت، ذرائع پیداوار اور دوسری چیزوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا، ان کا استحصال کیا۔''(۶)

یہ استعماری و سامراجی نظام آمرانہ شکل میں ہو یا فاسطی شکل میں، جمہوری شکل میں یا ملوکانہ شکل میں، یہ براہِ راست ہو یا بالواسطہ اس کے مذہبی، سیاسی، تاریخی، معاشرتی، معاشی جال ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں اور بے حد پیچیدہ ہیں۔ فیض فلسطین اسرائیل جنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''بیروت کا المیہ ان عناصر کا پیدا کردہ تھا جن کا دائرہ عمل لبنان اسرائیل یا مشرق وسطیٰ تک محدود نہ تھا۔ یہ تو کلاسیکی سامراج کے موجودہ وارثوں کی ساری دنیا پر اقتدار حاصل کرنے کی خواہش اور امن و ترقی کی قوتوں کے خلاف عالمی تشدد کو روا رکھنے والا محض ایک مرکز تھا۔ آپ کہیں بھی ہوں، برصغیر پاک و ہند میں ہوں یا مشرق وسطیٰ میں، اس مرکز نے اپنے جال ہر جگہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ اس کی چالیں بدلتی رہتی ہیں مگر مقصد وہی رہتا ہے۔ خواہ شکلیں بدل جائیں لیکن جوہر ایک ہی ہے جسے سب

جانتے ہیں۔''(۷)

فیض جانتے ہیں کہ عالمی استعمار اپنے استعمار کو مضبوط کرنے کے لیے مقامی لوگوں کا ایک حلقہ تیار کرتا ہے یہ حلقہ مغرب نواز آمریت اور ملایت و خانقاہیت پر مشتمل ہوسکتا ہے۔اس طرح نوآبادیاتی نظام دو دائروں پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ایک وہ حصہ خود مغرب یا طاقتور اقوام پر مشتمل ہے یعنی ملوکیت کا بین الاقوامی دائرہ اور دوسرا وہ جو مقامی مغرب نواز طبقات پر مشتمل ہے یعنی مقامی دائرہ۔ بین الاقوامی نوآبادیاتی نظام، ارباب اقتدار، آمر یا اسی قسم کے مقتدر طبقات بشمول ملّا وصوفی کو اپنے ساتھ لیکر چلتا تاکہ اپنے حسبِ منشا نظام وانتظام چلا سکے۔فیض نے ان کو ریاست کا استبدادی طبقہ اور محدود مذہبی شاونزم کا شکار طبقہ کا نام دیا ہے۔(۸)

فیض یہ بھی جانتے ہیں کہ استعماری نظام جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے مقامی نظام تعلیم، روایات اور ثقافت کو بھی مسخ کرتا ہے۔جدید وسائل اور عناصر کے ساتھ ''اپنی روایتوں پر قائم رہنا اور نبھانا وجود کی بقا کے لیے بنیادی شرط ہے'' جبکہ نوآبادیاتی نظام ایک ایسی نسل پروان چڑھاتا ہے جو نہ تو اپنی لوک روایتوں کا ادراک رکھتی ہے نہ کلاسیکی ثقافتی ورثہ سے واقف ہوتی اور اس میں سب سے زیادہ بگاڑ ابلاغِ عامہ پیدا کرتا ہے''(۹) غرض نوآبادیاتی نظام کے پیچیدہ جالوں کا کوئی خانہ ہو—— سیاسی، سماجی، ادبی، علمی، تعلیمی، ثقافتی، مقامی یا بین الاقوامی—— فیض نے اسے توڑنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی شاعری میں سامراجیت، استعماریت اور آمریت کے بتوں سے مسلسل ٹکراؤ، ٹکرا کر انہیں پاش پاش کرنے کی آرزو، جھوٹے معبودوں کا مسلسل انکار اور رجز کی زبان ملتی ہے اور یہ تمام عناصر حسین ولطیف نغمۂ شعر میں ڈھل کر نرم ونازک پھولوں کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے ان کا مضمون ''فن کا دائرہ وجود''(۱۰) بھی بے حد اہمیت کا حامل ہے۔جس میں انہوں نے ایفروایشیائی ادبی انجمن کی تاسیس وتشکیل کے عوامل، پس منظر، مقصد، دائرہ عمل اور پھر ایک فن کار کی ادبی وسماجی ذمہ داریوں پر نوآبادیاتی نظام کے تناظر میں روشنی ڈالی ہے اور اس حوالے سے نوآبادیاتی نظام کی تاریخ، دنیا پر بالخصوص ایفروایشیائی دنیا پر اس کے اثرات، اس کی نوعیت و ماہیت، اس کے مختلف حربوں اور اس کے استحصالی رویوں کا جائزہ لیا ہے(اس کا ایک اقتباس نوآبادیاتی نظام کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے مندرجہ بالا سطور میں دیا جاچکا ہے)۔ان کا موقف ہے کہ براہِ راست نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بظاہر مختلف ممالک نے قومی آزادیاں حاصل کرلیں لیکن حقیقت یہ ہے ''سیاسی آزادی کے اعلان اور عوام الناس کے لیے صحیح آزادی کے درمیانی فاصلے کو عبور کرنے میں کئی سال بلکہ کئی دہائیاں لگیں''۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی ماضی کے مشترکہ خصائص ایفروایشیائی

اقوام کی تہذیبوں اور قوموں کو وراثت میں ملے تھے یہ آج بھی ہماری معیشت، صنعت، تجارت اور تہذیب وارتقا پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ کلاسیکی نوآبادیاتی نظام نے ''باضابطہ طور پر نوآزاد ممالک کی اندرونی رجعت پسندوں کی قوتوں کے ساتھ معاہدہ کرلیا''۔ اس نئے نوآبادیاتی نظام نے برصغیر پاک و ہند، مشرق وسطیٰ، افریقہ، لاطینی امریکہ ہر جگہ اپنے جال پھیلائے، چالیں، شکلیں یقیناً مختلف ہونگی لیکن مقصد اور جوہر ایک ہی تھا یعنی ساری دنیا پر اقتدار حاصل کرنا۔ یہ ''عالمی اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے خوفناک طرز کے منصوبے'' تھے۔ اس طرح بظاہر ''دوسری جنگِ عظیم میں فاشزم کی شکست کے بعد نوآبادیاتی حکومتیں ختم ہونے لگیں تاہم یہ بھی نہیں بھول سکتے کہ ایفروایشیائی ممالک میں قومی آزادی کی تحریک کی فتوحات کا زمانہ ہی سرد جنگ اور ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کے آغاز کا زمانہ تھا جس سے آج انسانیت کی تباہی بلکہ شاید پورے سیارۂ زمین کی خوفناک بربادی کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں''۔ ان کے نزدیک اس کے پس منظر میں انسانی آبادی کے شدید غربت ہے اس کا ذمہ دار نیا پرانا نوآبادیاتی نظام ہے جس نے اخلاقیت کی بنیادوں کو ختم کر دیا ہے، انصاف کے تصور کو بے معنی کر دیا ہے۔ ہر شے یعنی اخلاقیات، عمل، محبت، فن، ادب اور خود زندگی خطرات سے دوچار ہے۔ انسانوں کے ہاتھوں انسان ذہن کی کارگزاریوں کے سبب پوری انسانیت کی تباہی ہے (کیا یہ وہی باتیں نہیں جو اقبال اپنے اشعار اور تقاریر و بیانات میں کر چکے ہیں) نئے نوآبادیاتی نظام کے مجموعی پھیلاؤ نے اپنے رجعت پسند وارثوں اور قوتوں کے ذریعے انسانیت بالخصوص افریقہ اور ایشیا کی عوام کے لیے مشکلات میں بے حد اضافے کیے ہیں۔ ایفروایشیائی اقوام پر نوآبادیاتی اثرات کی مماثلت نے خواہ ان کی تہذیبیں ایک دوسرے سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو نہایت پرزور انداز میں اتحاد کی ضرورت پر اصرار کیا۔ چنانچہ ترقی پسندانہ قلب و ماہیت کی دونوں سطحوں پر تحفظ کی ضرورت نے اس تحریک کو جنم دیا۔ ایک تو ''بین الاقوامی سطح پر نئے نوآبادیاتی نظام کے دباؤ کے خلاف'' اور دوسرے ''قومی سطح پر ہر ملک کی اپنی رجعت پسندانہ قوتوں کے خلاف'' یہ اس تنظیم کی اور اس سے وابستہ ہر ادیب کی دوہری ذمہ داری تھی اور دونوں ذمہ داریاں ایک دوسرے سے منسلک تھی۔

اس کا مطلب ہے کہ فیض احمد فیض نہ صرف اس تنظیم اور اس سے وابستہ ادیبوں بلکہ ہر ادیب کو ذاتی، ملکی و بین الاقوامی سطح پر تنقیدِ حیات کا فریضہ سونپتے ہیں یہ تمام دائرے ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں۔ اس لیے یہ تمام دائرے فنکار کے وجود کا حصہ ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی اس لیے ضرورت ہے کہ نئے نوآبادیاتی نظام کے پھیلاؤ اور دباؤ نے ایفروایشیائی اور لاطینی اقوام کو مشترکہ سماجی معاشی اور سیاسی صورتحال میں لاکھڑا کیا ہے۔ ان نوآبادیاتی اثرات نے ان براعظموں کے عوام کو ایسی قومیت میں متحد کر دیا ہے جو غلامی اور تسلط سے نجات حاصل کرنے کے بعد اب ایک نئی طرح کی غلامی اور تسلط میں جکڑے جا رہے ہیں۔ فیض اسے ''روحانی نو

آبادیت'' کا نام دیتے ہیں۔اب تمام ادیب سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر بھی ایک دوسرے منسلک ہیں اور ذاتی طور پر بھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ادیب خواہ کتنے ہی جوش وخروش سے کیوں نہ چاہتا ہو وہ خود کو ادبی دائرے میں محسور نہیں رکھ سکتا تھا، نہ ہی وہ محض قومی مفادات کے دائرہ میں رہ سکتا تھا۔قومی اور بین الاقوامی دائرے دونوں ایک دوسرے کا تکملہ تھے۔''ادیب کو اپنے وجود کے تینوں دائروں کو اکٹھا کرنا تھا''۔ادیب کے لیے ضروری تھا (اور ہے) کہ ایک تو وہ اپنے عوام اور اپنی تہذیب کے ساتھ تعلق جوڑے جن سے نو آبادیاتی نظام تعلیم نے اسے الگ کر دیا تھا پھر آگے بڑھ کر دوسرے ممالک کے ادیبوں کے ساتھ سب سے بڑھ ایفرو ایشیائی ادیبوں کے ساتھ کیونکہ ''سب کو ایک ہی کام سرانجام دینا اور وہ تھا روحانی نو آبادیت کا خاتمہ''۔نو آبادیاتی نظام کے پھیلاؤ اور جکڑ بندی نے جو مشترک صورتحال نو آبادیات میں پیدا کر دی ہے ان کا خیال ہے کہ عالمی اقتدار پر قبضے کے لیے خوفناک انداز میں تشکیل دیے گئے منصوبوں کا ارتقا یہ ہے کہ ''پہلا دائرہ ذاتی دُکھ سکھ کا ہے۔ یہ دائرہ اردگرد بسنے والوں کی زندگی اور قرب میں مدغم ہونے چاہیے۔ یہ دوسرا دائرہ ہے۔اس دوسرے دائرہ کو تیسرے دائرے یعنی مختلف اقوام کے بین الاقوامی مسائل کی طرف رہنمائی کرنی چاہیے۔اس تیسرے دائرے کو چوتھے دائرے یعنی اس سرزمین پر بسنے والی تمام انسانیت کی زندگی کو شامل کرنا چاہیے۔''(۱۱)

فیض نے اس نظریے کا اظہار دست تہہ سنگ (۱۹۶۵ء) کے دیباچے میں بھی اسے رائے کا اظہار کرتے ہوئے کیا تھا کہ ''اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا............ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس میں بہرحال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں............اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں۔ خاص طور پر انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں''(۱۲)

اگرچہ ''دست تہہ سنگ'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تاہم ان سطور میں خیالات کا اظہار اس دور کے حوالے سے کیا گیا ہے کہ جب تقسیم ہند سے قبل ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تھی اور فیض نے اس کی رہبری کے لیے خدمات کا فریضہ ابھی سنبھالا ہی تھا۔فیض ابھی نوجوان تھے تجربات کی بھٹی سے نہیں گزرے تھے گویا فیض نے ان خیالات کا اظہار ماضی میں اتر کر کیا ہے یا یوں کہیے کہ ماضی کے لیے کیا ہے۔اس لیے فیض نے اس میں عام ترقی پسندانہ انداز اختیار کیا ہے جبکہ مضمون ''فن کار کا دائرہ وجود'' فیض نے حال میں رہ کر لکھا ہے اس وقت جب وہ ۳۰، ۴۰ سال کا عرصہ فکری و عملی طور پر سامراج کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے گزار چکے ہیں۔اس لیے اس میں جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ پختہ ترین شعور کے نتیجے میں ابھرتا ہے۔ چنانچہ اس میں جو خیالات ہیں ایک تو وہ تجربات کی کٹھالی

میں پک کر سامنے آتے ہیں دوسرے یہ خیالات بین الاقوامی استعماری نظام کے گہرے تجربے، مطالعے اور مشاہدے کے نتیجے میں پیش کیے گئے ہیں اور خالصتاً نوآبادیاتی نظام کے تناظر میں بین الاقوامی ایفروایشیائی ادبی انجمن کو مدنظر رکھ کر پیش کیے گئے ہیں۔ درحقیقت یہی فیض کا فکری ارتقا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس میں عمومیت و آفاقیت کا پہلو بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ فیض کی فکر مسلسل ارتقاء پذیر رہی، اس میں مسلسل حالات کے تحت ارتقاء، تغیر وتبدل پیدا ہوا لیکن گہرائی اور گیرائی، توازن اور عمومیت وآفاقیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ چنانچہ ان کا موقف یہ ہے ادیب ملکی و بین الاقوامی مسائل کو اپنے احساسات کا حصہ بنالے۔ گویا خارج اپنی پوری وسعت کے ساتھ ادیب کی ذات میں اس طرح گھل مل جائے کہ خارج خود اس کی ذات بن جائے اس لیے کہ ''ادیب محض وہی کچھ بیان کرسکتا ہے جس کا اس نے عقلی اور جذباتی طور پر تجزیہ کیا ہو۔ حقیقی ادب پیدا کرنے کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے'' (۱۳) بین الاقوامی معاشی استعماری نظام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ادیب کے لیے ضروری ہے کہ عالمی طور پر پیدا ہونے والے واقعات، احساسات کو اپنے احساسات میں ڈھال لے ''وہ محسوس کرے، سوچے اور اظہار کرے۔ لوگوں کو اس ضرورت کا احساس دلائے کہ ان کی اور ساری دنیا کی زندگی ایک دوسرے پر منحصر ہے۔'' ''لاکھوں افلاس زدہ انسانوں کو عالمی سطح پر سوچنے اور عمل کرنے کی ضرورت کا احساس دلانا، قومی اور ایفروایشیائی جہتوں کو ملانے اور پھر آفاقی سطح پر انسانی جہتوں میں انہیں مدغم کرنے کی ضرورت کا احساس دلانا۔ یہ ایک ادیب کے، ادیبوں کی قومی ایفروایشیائی انجمنوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ عالمی سطح پر یہ مسئلہ ساری دنیا کے ادیبوں کو حل کرنا چاہیے۔'' (۱۴)

فیض کی ساری زندگی علمی سطح پر بھی اور فکری وتخلیقی سطح پر بھی انہی نظریات کی عکاس ہے۔ انہوں نے یورپی استعمار کے دور میں آنکھ کھولی اور امریکی استعمار کے دور میں دائمی اجل کو لبیک کہا۔ شروع سے آخر تک انہوں نے استعمار کی استحصالی قوتوں کے خلاف مزاحمت واحتجاج اور تصادم جاری رکھا۔ یہ ان کی استعمار دشمنی اور انسان دوستی کا واضح ثبوت ہے۔ انہوں نے (فرانز فینن کے لفظوں میں) ''دیسی باشندہ'' کی تعمیر وترقی اور تہذیب کے لیے اور (سارتر کے لفظوں میں) ''نئے انسانوں کی حقیقی تخلیق'' کی خاطر ''استعمار کی شکست وریخت'' (۱۵) کے لیے استعمار کے خلاف فکری وتخلیقی سطح پر جنگ جاری رکھی۔

فیض نے تدریس، صحافت، فوج، ٹریڈ یونین، فلم، تہذیب وثقافت، سماجی خدمات، سفر وسیاحت، قید تنہائی، شعر وشاعری، تنقید وتحقیق، ذاتی اور ازدواجی زندگی ـــــ غرض ہر شعبۂ حیات میں انسانیت اور محبت کو مدنظر رکھا۔ امرتسر، لاہور اور کراچی میں تدریس، ادب لطیف، پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز، لیل ونہار اور لوٹس کی

ادارت، انجمن ترقی پسند مصنفین، حکومت پنجاب لیبر ایڈوائزر کمیٹی، پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن، عالمی امن کونسل، ایفروایشائی ادبی انجمن اور ۱۹۵۰ء کے بعد سے آخر تک ایرانی عوام، فلسطینی عوام اور افریقی عوام کی تحریک آزادی سے وابستگی، راولپنڈی سازش کیس اور پھر ایوبی آمریت کے خلاف مزاحمت کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں، برطانوی استعمار کے خلاف فوج سے وابستگی اور پھر علیحدگی، آرٹس کونسل، فلمی صنعت، امورِ ثقافت اور وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان سے وابستگی، مزدور اور پسے ہوئے طبقے کے لیے عملی جدوجہد، بین الاقوامی علمی و ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں شرکت اور کئی یونیورسٹیوں میں توسیع لیکچرز غرض فیض کی زندگی بے حد متنوع اور متحرک ہے(۱۶) سامراج کے دیو استبداد خلاف اور لیلائے وطن کی محبت میں ایسا تحرک، ایسا مجاہدہ اور ایسی مزاحمت پاکستانی شاعروں ادیبوں کے ہاں شاید ہی ملے۔عتیق احمد نے درست ہی لکھا کہ ''عالمی سطح پر عصری آزادیوں کی تحریکات اور جنگ مثلاً چین، ایران، انڈونیشیا، کوریا، افریقہ (بالخصوص مصر اور کانگو) فلسطین وغیرہ اور عالمی امن کے لیے جدوجہد اور تحریکات کے ساتھ وہ بھرپور انداز میں معتہد (کمیٹڈ) رہے اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں مزدوروں کے مسائل (بالخصوص پوسٹل یونین جس کے وہ صدر بھی تھے) اور ان کی اٹھائی ہوئی تحریکات اور امن کی جدوجہد میں برابر کے شریک رہے___سب سے اہم نکتہ جو فیض کی شاعری پر لکھی گئی تنقیدوں میں بالصراحت مرکزی خیال نہیں بنا وہ ان کے اندر اپنا عہد جینے کی امنگ، اس کے نشیب و فراز کے ساتھ پوری حوصلہ مندی سے ہم سفر رہنا اور ایک مسلسل تڑپ اور اضطراب مسلط کیے جانے کے باوجود اندرونی طور پر کوہِ گراں کی طرح ڈٹے رہے۔''(۱۷) درحقیقت ان کے نظریے کے عین مطابق سامراج کے خلاف جدوجہد اور انسانیت کی محبت ان کی روح اور احساس کا حصہ بن گئی تھی۔ انہوں نے ذاتی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سوچنے اور عمل کرنے کی عملی مثال پیش کی۔ چنانچہ ایران، افریقہ، فلسطین اور تمام افتادگانِ خاک سمٹ کر فیض کا دل بن گئے تھے۔یہی کیفیت ان کی شاعری کی بھی ہے۔

ان کی تمام شاعری ملکی و بین الاقوامی نو آبادیاتی کے خلاف مزاحمت، بین الاقوامی منصفانہ نظام کی تخلیق، بہبودِ انسانی اور اس کے ساتھ ایک حوصلہ مند دل کی دلکش مثال ہے گویا ان کے نظریات اور زندگی کا تخلیقی منشور ہے۔ ان کے تمام شعری مجموعوں نقشِ فریادی (۱۹۴۱ء)، دستِ صبا (۱۹۵۲ء)، زندان نامہ (۱۹۵۶ء)، دست تہہ سنگ (۱۹۶۵ء)، سروادی سینا (۱۹۷۱ء)، شام شہر یاراں (۱۹۷۸ء)، مرے دل مرے مسافر (۱۹۸۱ء)، غبارِ ایام (۱۹۸۴ء)، اور کلیات نسخہ ہائے وفا (۱۹۸۷ء) کی تمام نظموں غزلوں میں مشاہدے، مجاہدے اور احساس کی یہی کیفیت لہریں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔تحقیقی تقاضے کے پیشِ نظر یہاں چند منظومات کے نام درج کیے جاتے ہیں دیکھئے: مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ، چند روز اور مری جان، کتے، بول، موضوعِ سخن (منظومات مشمولہ

نقشِ فریادی) مرے ہدم مرے دوست، صبحِ آزادی، لوح وقلم، شورشِ بربط و نے، طوق وداری کا موسم، ایرانی طلبہ کے نام، اگست ۵۲، نثار میں تری گلیوں کے اے وطن..........، شیشوں کا مسیحا، زنداں کی ایک، زنداں کی ایک صبح، یاد، (منظومات مشمولہ دست صبا) ملاقات، واسوخت، اے روشنیوں کے شہر، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، دریچہ (منظومات مشمولہ زنداں نامہ) غم نہ کر، سروادیِ سینا، داغستان کے ملک الشعراء رسول حمزہ کے افکار (منظومات مشمولہ سروادیِ سینا)، اے شام مہرباں ہو، تم اپنی کرنی کر گزرو، لینن گراڈ کا گورستان (منظومات مشمولہ شامِ شہر یاراں)، دل من مسافر من، لاؤ تو قتل نامہ مرا، یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے، دو نظمیں فلسطین کے لیے (منظومات مشمولہ مرے دل مرے مسافر)، وبیقیٰ وجہ ربک نظم مشمولہ مرے دل مرے مسافر (اصل بیاض) ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے، ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لیے، نذرِ مولانا حسرت موہانی، ترک شاعر ناظم حکمت کے افکار، نعت (فارسی)، (منظومات مشمولہ غبارِ ایام)۔

''نئی احتجاجی شاعری جس کے موجد علامہ اقبال ہیں'' (۱۸) اس میں نوحے یا مڑ کر پیچھے دیکھنے کا انداز نہیں بلکہ یہ احتجاج نئی دنیاؤں اور نئی انسانیت کی تعمیر کرتا ہے۔ اس کا انداز تاریخی ہے۔ ''فیض صاحب دورِ حاضر کی احتجاجی شاعری کے بڑے سچے نمائندہ ہیں'' (۱۹) یہ شاعری زوال وانحطاط کے اسباب وعلل کا تجزیہ کرتے ہوئے نہ صرف ان کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ زوال پذیر اور بوسیدہ دیواروں کو گرا کو انکی بنیادوں پہ نئی دنیا کو تعمیر کرتی ہے۔ تاریخی انداز، تجزیہ وتبصرہ اور تنقید فکشن میں جس طرح قرۃ العین حیدر نے اختیار کیا شاعری میں یہ فیض کا کمال ہے کہ اسے مارکسی نقطۂ نظر سے شعر ونغمہ میں ڈھال دیا۔ شعری اسالیب کی نہایت فنکاری کے ساتھ معنوی توسیع کی بالخصوص غالب اور اقبال کے مروج اسالیبِ شعری کو اپنے عہد کے طرزِ احساس اور فکری رویوں کے ابلاغ کے لیے نہایت عمدگی سے برتا۔ زوال وانحطاط پیدا کرنے والی نوآبادیاتی قوتوں کا تاریخی، معاشی، سماجی تجزیہ کر کے جہدِ حیات، گرمئ حیات، مزاحمت، امید ونشاط، ولولہ اور جوش کو ایک ساتھ بیدار کیا۔ ملکی سطح پر بھی انہوں نے تقسیم ہند کے نتیجے میں ملنے والی ''صبح آزادی'' کو نوآبادیاتی نظام کا تسلسل قرار دیتے ہوئے ''لیلائے وطن''، کو ''داغ داغ اجالے'' اور ''شب گزیدہ سحر'' کی حقیقت بتاتے ہوئے سمجھایا کہ ''نجاتِ دیدہ ودل'' کی گھڑی ابھی نہیں آئی ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی''۔ انہوں نے سمجھایا کہ ''بازار میں بکتا ہوا مزدور کے گوشت''، ''متاع لوح وقلم'' کا زیاں، ''اہلِ ستم کا مشق ستم''، ''تلخئ ایام''، ''بھوک''، افلاس، بیماری، سلاسل، ''طوق ودار کے موسم''، ''تاریک راہوں'' میں مارا جانا، ''زنداں''، ''جیل''، غرض سماجی طاقتوں کی تخریب کاریاں، سرمایہ دارانہ نظام، غلامانہ استبداد، نفع اندوزی، انسانی وقار کی بے حرمتی، عوام الناس کی زبوں حالی یہ سب نوآبادیاتی نظام کی گھناؤنی شکلیں اور اثرات ہیں، سماجی بدصورتی

کے پہلو ہیں جن کے باعث فرد اپنے تخلیقی جوہر، اپنے فطری حقوق اور اپنی اظہارِ صلاحیت سے محروم ہے۔ فیض نے اپنی شاعری میں ''صدیوں کے تاریک بیہمانہ طلسم'' کے خلاف بغاوت کی ہے۔ پاکستان، فلسطین، افریقہ، وادی سینا، یہ سب ایک ساتھ ان کی شاعری میں ان کے دل کی دھڑکن بن کر ابھرے ہیں۔ وہ فلسطین پر ''یلغار اعداء'' کا شور اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں، وہ بیروت کے ''بچوں کی ہنستی آنکھوں کے چکنا چور آئینوں'' کی کرچیاں بھی اپنے دل میں چبھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، بالخصوص وہ ارض فلسطین کو اپنا دوسرا وطن محسوس کرتے ہیں، ''اعدا'' ایک فلسطین کو تباہ کرتے ہیں تو ان کے زخموں میں کئی فلسطین آباد ہوتے ہیں'' یہاں تک ان کی اور فلسطینوں کی تباہی، مصائب، غم واندوہ اور بالآخر فلسطینیوں کی اور ان کی زندگی ایک ہو جاتی ہے۔'' یہ سب ''عشاق کے قافلے'' ہیں جو ان کی شاعری میں اس عالمی استبدادی نظام کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد اپنی ذات کی تعمیر کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے حسن اور لطافت کے لیے ہے۔ یہ محبت ''یہ درد اس رات کا شجر ہے جس میں لاکھوں مشعل بکف ستارے ہیں'' یہ انسانیت ان کی شاعری کا جوہر ہے اس لیے ایک طرف وہ وطن کی گلیوں پر نثار ہوتے ہیں تو دوسری طرف ایرانی طلبا کے ''میٹھے نور اور کہڑوی آگ سے ظلم کی اندھی رات میں صبح بغاوت کا گلشن پھوٹتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ ''فلسطینی بچے کو لوری'' دیتے ہیں، ''کربلائے بیروت کے لیے نغمہ خواں'' ہوئے ہیں، ''ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لیے'' لکھتے ہیں۔ پھر ان کی اس مزاحمت اور بغاوت میں اداسی کے لمحات تو ضرور آتے ہیں لیکن وہ مایوس نہیں ہوتے۔ وہ خود بھی مسلسل بت شکنی کی طرف بڑھتے ہیں اور ظلم کے مارے طبقات کو بھی اپنے ساتھ بت شکنی پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ''خزاں دم بھر کے لیے ٹھہرتی ہے'' اور ''بہار پل بھر کے لیے رکتی ہے''۔ وہ ''بازار میں دست افشاں، مست ورقصاں، خاک بر سر'' خوں بداماں چلتے ہیں'' انہیں ''مقام کوئی راہ میں جچتا ہی نہیں'' وہ کوئے یار سے نکلتے ہیں اور سوئے دار چلِ پڑتے ہیں'' وہ تسلی دیتے ہیں کہ ''درد تھم جائے گا غم نہ کر غم نہ کر'' انہیں یقین ہے کہ ''ہم جیتیں گے، حقا ہم اک دن جیتیں گے، بالآخر اک دن جیتیں گے'' اس لیے ''متاع لوح وقلم ان سے چھنتی بھی ہے تو وہ انگلیاں خوں میں ڈبو لیتے ہیں'' اسی لیے وہ ''ظلم کے ماتوں'' کو بیدار کرنے کے لیے ترانہ لکھتے ہیں اور تسلّی دیتے ہیں کہ ''اے خاک نشینو اب اٹھ بیٹھو وہ وقت آن پہنچا ہے کہ سب تخت گرائے جائیں گے اور سب تاج اچھالے جائیں گے'' اس لیے وہ کہتے ہیں کہ شورشِ زنجیر بسم اللہ''، اسی لیے ان کے ''ہاں زنداں زنداں شورِ انا الحق اور محفل محفل قلقل مے'' سنائی دیتی ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ''تم اپنی کرنی کر گزرو''، ''انہیں یقین ہے کہ ایک دن ''راج کرے گی خلقِ خدا''، وہ کہتے ہیں:۔

''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے کبھی ہار نہیں کھائی۔ اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی

اور آخر کار جنگ ونفرت اور ظلم وکدورت کی بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی:۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است (۲۰)

فیض احمد فیض صحیح معنوں میں ''امن عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کے شاعر ہیں اور اختلافات کے منصفانہ حل پہ غور وفکر'' (۲۱) میں عالمی امن کا حل تلاش کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں زیادہ تر، فیض ہی کی لفظیات، تراکیب اور مصرعوں کو اختیار کر کے فیض کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں حسن ومحبت، حب الوطنی، انسان دوستی، حریتِ فکر، سماجی ومعاشی انصاف، انسانی اقدار کی بالا دستی، انقلاب پسندی اور بین الاقوامی امن وامان کے شاعر ہیں اور یہ ساری اقدار ان کے دل سے پھوٹتی ہیں۔''فیض کی پوری زندگی انسانوں اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں میں صرف ہوئی'' اقبال کے بعد فیض اردو کا دوسرا شاعر ہے جسے بین الاقوامی شناخت ملی اور عوامی سطح پر پذیرائی بھی (۲۲) وہ صحیح معنوں میں انقلاب کے نقیب اور ''نو آزاد قوموں کے سوانح نگار'' ہیں (۲۳) وہ ''ایک بڑے سماجی آئیڈیل سے والہانہ وابستگی رکھنے والے شاعر ہیں'' وہ ''ہمارے دور میں مجبوروں محروموں اور مظلوموں کی حمایت کرنے والے سب سے اہم شاعر ہیں۔امن اور آزادی کے معتبر ترین ترجمان اور ساری دنیا کے انسانوں میں محبت، پیار اور انسان دوستی کے آرزو مند رہنما کی حیثیت سے ایک علامت، ایک نشان کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں'' (۲۴) ''ان کا ذاتی نصب العین درویشی تھا تو اجتماعی مسلک انقلاب'' (۲۵) ''فیض بڑے شاعر ہیں کہ انہوں نے نئے Images دیے ہیں، نیا انقلابی آہنگ دیا ہے اور ان کے اس انسانیت کی جدوجہد کے آہنگ میں پورے ایشیاء، پورے عرب اور پوری دنیا کی تحریکِ آزادی شامل ہو جاتی ہے۔'' (۲٦) یاسر عرفات نے ان کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔''انہوں نے انقلابیوں، دانشوروں اور فنکاروں کے لیے بے نظیر اثاثہ چھوڑا ہے اب جب کہ وہ دل جو حصولِ آزادی کے لیے بے مثال جذبے کے ساتھ دھڑکتا تھا دنیا کے عوام کے مستقبل کی بہبود اور انصاف کے لیے دھڑکتا تھا، دھڑکنا بند ہو چکا ہے.............فیض کی انقلابی تخلیقات آنے والی نسلوں کی یادداشت میں اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک آزاد خودمختار فلسطین کے حصول کے لیے ان کا عظیم خواب پورا نہیں ہوتا اور ایک ایسی دنیا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا جہاں ترقی ہو، بہبود ہو، انصاف اور محبت کا بول بالا ہو۔'' (۲۷)

اگرچہ ہم نے مختلف مقامات پر فیض ہی کی شعری لفظیات کے ذریعے تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے پھر بھی

یہاں تحقیقی تقاضے کے پیشِ نظر اور مندرجہ بالا اپنے تمام تر مباحث کی تصدیق کے لیے چند اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ دراصل یہ ایک نظم ہے ''ویبقیٰ وجہ ربک'' یہ فیض کی نمائندہ ترین اور مقبول ترین نظم ہے۔ یہ نظم ''مرے دل مرے مسافر'' میں شامل تھی۔ لیکن جب مجموعہ شائع ہوا تو اس سے نکال دی گئی اور نسخہ ہائے وفا میں بھی اسے شامل نہیں کیا گیا۔ اب جبکہ پاکستان میں فیض صدی (۲۰۱۱ء) کے موقع پر ''مرے دل مرے مسافر'' کی اصل بیاض کو (جو افتخار عارف کی امانت تھی انہوں نے اسے) فیض ہی کے خط (تحریر) میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع کرا دیا ہے تو اسی بیاض سے اس نظم کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ ذرا دیکھئے:۔

هم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم وستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی
جب ارض خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی

جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اس بحث کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیض کی زندگی اور شاعری نوآبادیاتی نظام کے استبداد کے خلاف ایک طاقتور عملی اور تخلیقی ردِعمل ہے۔ان کی شاعری پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف ان کی مسلسل اور لازوال جدوجہد، مزاحمت اور کمٹ منٹ کے گہرے اثرات ہیں۔فیض پر اس نقطۂ نظر کے تحت ایک جامع سوانح اور تنقید کی ضرورت ہے۔اس انداز میں مطالعہ فیض کو عموماً اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔آج جبکہ امریکی سرپرستی میں ایک طاقتور یک قطبی معاشی نوآبادیاتی نظام نے ساری دنیا کو اپنے پیچیدہ اور آہنی شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے ــــ تاریخ کا خاتمہ، تہذیبی آفاقیت، تہذیبی تصادم اور تہذیبی مشن کے نام پر ساری دنیا میں معاشی، سیاسی، سماجی، تہذیبی قتل و غارت گری اور استبداد کا ایک بازار گرم کیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی آجکل جبکہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف دنیا بھر میں مظاہرے بھی ہو رہے ہیں۔خود سرمایہ داری کے قلب (وال اسٹریٹ، امریکہ) سے اٹھنے والی یہ مزاحمتی تحریک (Occupy wall street) دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیلتی چلی جارہی ہے (۲۸) تو ایسے عالم میں یقیناً اقبال کے بعد فیض ہی وہ شاعر ہیں جن کا پرامن ترقی پسند اور روشن خیال نقطۂ نظر اور اس کے تحت نوآبادیاتی نظام کے خلاف ان کا متحرک اور فعال تخلیقی و عملی مزاحمت اور احتجاج ہمیں تاریک راہوں میں راستہ دکھا سکتا ہے۔اس لیے کہ جدید اردو شاعری میں اس بھیانک پیچیدہ جدید ترین سرمایہ دارانہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف سب سے توانا، موثر اور تخلیقی صدائے احتجاج اقبال کے بعد فیض ہی کی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ کپلنگ کی نظم ''سفید آدمی کا بوجھ'' (White man's burdern) کے لیے ملاحظہ کیجئے:۔
Kipling, Rudyard, "The works of Rudgard Fipling, Edited and published by wordworth poetry library, Hertford-shire, 1994, PP-323,324

۲۔ اقبال، شذراتِ فکر اقبال، ترجمہ افتخار احمد صدیق، ڈاکٹر مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۶

۳۔ اس حوالے سے مختلف پہلوؤں پر تنقید وتبصرہ اقبال نے کیا ہے۔ یہاں سب کا ذکر کرنا ناممکن ہے البتہ تحقیقی شرط کو پورا کرنے کے لیے چند اشاروں پر اکتفا کیا جاتا ہے مثلاً دیکھئے:۔نظم ''وطنیت'' (بانگِ درا)، نظم ''خضرِ راہ'' (بانگِ درا)، ''مارچ ۱۹۰۷ء کی غزل'' (بانگِ درا)؛ نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' (بالِ جبریل)؛ نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' (ارمغانِ حجاز)؛ نظم ''پس چہ باید کرد......'' اور ''حکمتِ حکیمی وحکمت فرعونی''؛ ''پیغامِ افغانی با ملت روسیہ'' (جاوید نامہ)، ''پیامِ مشرق کا دیباچہ''؛ ''خطبہ الہ آباد'' کے بعض مباحث؛ مضمون ''اسلام اور جغرافیائی حدود''؛ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو سالِ نو کے موقع پر اقبال کی ریڈیائی تقریر (مشمولہ حرفِ اقبال مرتبہ لطیف احمد شیروانی)؛ خطبات میں مغربی تہذیب پر تبصرہ مثلاً خطبہ اول، پنجم، ششم اور ہفتم کے بعض بیانات۔

۴۔ فیض نے کہا تھا کہ ''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے''۔ دیکھئے:۔ ''دستِ صبا'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، سن ندارد، ص ۱۰۳/۷

۵۔ امپریلزم اور کولونیلزم سے متعلق مباحث کے لیے مختلف ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے مثلاً دیکھئے:۔
مبارک علی، ڈاکٹر، ''تاریخ اور آج کی دنیا''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۱ تا ۷۹؛
مبارک علی، ڈاکٹر، ''تاریخ کی آواز''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۳ تا ۱۵۸، ۱۷۲ تا ۱۷۵؛
مبارک علی، ڈاکٹر، ''تاریخ اور سیاست''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۷۲ تا ۸۸، ۱۰۶، ۱۲۳ تا ۱۳۷؛
مبارک علی، ڈاکٹر، ''جاگیرداری''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۹ تا ۱۱؛

قاضی جاوید، ''سرسید سے اقبال تک''، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۹ تا ۱۱؛
قاضی جاوید، ''ہندی مسلم تہذیب''، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۲۸ تا ۳۳۱؛
محمد آصف، ڈاکٹر، ''اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش: فکرِ اقبال کے تناظر میں''، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷۴ تا ۲۸۲؛
Hobson, J.A. "Imperialism: A study" George Allen and Unwin Ltd. London, 1902, P.301,22;
Eldrige, C.C., "Victorian Imperialism" Hodder and Stoughton, Lodon, 1978, PP-161, 50,51;
Aziz. K.K., "The British in India (A study in Imperialism)", National Commission on Historical and Cultural Research, 1976, P-5,
Metcalf, Thomus, R., Idiologies of the Empire", Cambridge, 1995, PP.2,3,6,90;
Fukuyama, Francis, The End of History" (Article), The National Interest 16, Summer, 1989, PP-4,18;
Fukuyama, Francis, "The end of History and the lastman", The Hearst Corporation, New York, 1992, PP-288,125'
Hungtington, S.P., "The Clash of Civilizations and the remaking of new world order", Touch Stone, New York, 1997, See PP-83, Part IV, 308 to 312 to 321;
Tariq Ali, "The Clash of Fundamentalisms, Verso, london, 2003, PP-305;
Said Adward, "Orientalism", Penguin Books, India, 2001,

PP-7 to 9, 25, 26, 300 to 302;

Cheryl Benard, "Civil Democratic Islam", Rand Corporation, Los Angeles (CA), 2003, PP-47, iii,ix

۶۔ فیض، فیض احمد، ''باتیں فیض سے''، مرتبہ، شیما مجید، روہتاس بکس، ۱۹۹۰ء، ۶۹

۷۔ فیض، فیض احمد، مضمون ''فنکار کا دائرہ وجود''، مشمولہ، فیض احمد فیض: درد اور درماں کا شاعر''، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، پیس پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ۱۶۸، ۱۶۹

۸۔ فیض، فیض احمد، ''باتیں فیض سے''، مرتبہ، شیما مجید، ص ۴۱

۹۔ ایضاً، ص ۴۲، ۴۳

۱۰۔ یہ مضمون سجاد باقر رضوی کے ترجمے کی صورت میں ماہِ نو، لاہور'سارک ادب نمبر'، نومبر دسمبر ۱۹۸۸ء، میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنی کتاب ''فیض احمد فیض: درد اور درماں کا شاعر''، میں شامل کیا ہے۔ ہم نے حوالے کے لیے اسی کو سامنے رکھا ہے (دیکھئے: ص ۱۶۳ تا ۱۷۰)

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ فیض، فیض احمد، ''دستِ تہہ سنگ''، مشمولہ، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۶/ ۳۰۶

۱۳۔ فیض، فیض احمد، مضمون ''فنکار کا دائرہ وجود''، مشمولہ، فیض احمد فیض: درد اور درماں کا شاعر''، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، ص ۱۶۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۱۵۔ فینن، فرانز، ''افتادگانِ خاک''، ترجمہ، سجاد باقر رضوی/ محمد پرویز، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۲

۱۶۔ فیض کی زندگی اور جہدِ حیات کے لیے مختلف ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے یہاں چند نام درج کیے جاتے ہیں دیکھئے مثلاً ☆ ''نسخہ ہائے وفا'' میں موجود دیباچے ☆ ''باتیں فیض سے'' مرتبہ شیما مجید ☆ مہ و سال آشنائی/ فیض احمد فیض، ☆ مضمون ''فنکار کا دائرہ وجود'' مشمولہ فیض احمد فیض، درد اور درماں کا شاعر/ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ☆ سخن در سخن/ سید سبطِ حسن ☆ فیض فہمی/ ڈاکٹر سید تقی عابدی ☆ جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا۔ فیض احمد فیض شخصیت اور فن/ ☆ ڈاکٹر صلاح الدین حیدر ☆ فیض احمد فیض: شخصیت اور فن/ اشفاق حسین ☆ پرورشِ لوح و قلم۔ فیض حیات اور تخلیقات/ اوسیلیو ☆ فیض۔ عہد اور شاعری/ عتیق احمد ☆ فیض: محبت و انقلاب کا شاعر/ ثاقب

رزمی ☆ فیض: شاعر اور شخص/ آفتاب احمد ☆ فیض: شاعری اور سیاست/ فتح محمد ملک

۱۷۔ عتیق احمد، پروفیسر، ''فیض-عہد اور شاعری''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۴۱

۱۸۔ سبطِ حسن، سید، ''سخن در سخن''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۶

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ فیض، فیض احمد، ''دستِ تہہ سنگ (تقریر)، مشمولہ نسخہ ہائے وفا، ص ۱۱،۱۲

۲۱۔ ایضا، ص ۱۲

۲۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، مضمون ''پاکستانی مقتدرہ کی نظریاتی تعبیریں......فیض''، مشمولہ، تری یادوں کے نقوش، مرتبہ، شاکر حسین شاکر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸۴

۲۳۔ جیلانی کامران، مضمون ''فیض: نوآزاد قوموں کا سوانح نگار''، مشمولہ، فیض کی شاعری، مرتبہ اشتیاق احمد، کتاب سرائے، ۲۰۱۰ء، ص ۲۷۱

۲۴۔ دیکھئے کتاب: فیض احمد فیض (فیض صدی، منتخب مضامین)، مرتبہ، یوسف حسن، پروفیسر، روش ندیم، ڈاکٹر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۷،۵

۲۵۔ فتح محمد ملک، ''فیض شاعری اور سیاست''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵

۲۶۔ دیکھئے کتاب ''فیض فہمی''، مرتبہ، سید تقی عابدی، ڈاکٹر، ملٹی میڈیا افیئر ز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۳۲

۲۷۔ یاسر عرفات کے پیغام کے لیے دیکھئے: ''کلام فیض بخطِ فیض: مرے دل مرے مسافر-اصل بیاض''، (امانت افتخار عارف)، شائع شدہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۳۷؛
یہ مکمل پیغام تری یادوں کے نقوش، مرتبہ، شاکر حسین شاکر میں ''فیض مرے دوست'' کے نام سے شامل ہے۔
یہی پیغام ''فیض میرے دوست اور جنگ بیروت کے رفیق تھے'' کے عنوان سے فیض احمد فیض (فیض صدی: منتخب مضامین) مرتبہ پروفیسر یوسف حسن/ ڈاکٹر روش ندیم میں بھی شامل ہے۔

۲۸۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اٹھنے والی اس تحریک کی تفصیلات مختلف ذرائع ابلاغ کے وسیلے سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔مثلاً دیکھئے:۔
روزنامہ جنگ ملتان، ۱۶/اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص ۱،۶؛
ایضاً، ۷/نومبر ۲۰۱۱ء؛

روز نامہ جنگ (سنڈے میگزین)، ۲۰ نومبر ۲۰۱۱ء؛

اس حوالے سے سہ ماہی مجلّہ ''ارتقاء'' میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا تحریر کردہ اداریہ بعنوان ''وال اسٹریٹ پر قبضے کی تحریک: سرمایہ دارانہ نظام کا نیا بحران'' بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دیکھیے: ''ارتقاء'' شمارہ -۵۲، ۲۰۱۱ء، ص ۷ تا ۹؛

ڈاکٹر انوار احمد نے اسی تناظر میں اقبال کی نظم ''قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور'' کا اردو ترجمہ کر کے اسے ''اخبارِ اردو'' کی پشت پر شائع کیا ہے۔ دیکھیے:۔

ماہنامہ ''اخبارِ اردو''، شمارہ -۱۰، جلد -۲۸، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۱۱ء